اسرارِ خودی - ادباء وحکماءِ مغرب کی نظر میں

چوہدری محمد حسین

زمانہ حال کے فلسفہ مذہب، شاعر اور عام علم ادب میں علامہ اقبال کا کیا پایہ ہے یا علامہ اقبال کے فلسفہ مذہب اور شاعری کا زمانہ حال پر کیا اثر ہو رہا ہے اور یہ اثر اس ''حال'' کو کس ''مستقبل'' میں بدلنا چاہتا ہے؟ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات سے بصورت موجودہ مشرقی اقوام کے عام افراد قاصر ہیں۔ کیوں قاصر ہیں؟ اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے زمانہ کو زمانہ کے محقق کی نگاہ سے دیکھا ہو، مشرق و مغرب دونوں کی سیر کی ہو؟ دونوں کے علوم وفنون، تمدن و معاشرت، مذہب و سیاست، اخلاق و رجحان، طبائع کا وسیع مطالعہ کیا ہو۔ اور پھر یہ اہلیت رکھتا ہو کہ صحیح مطالعہ کے بعد صحیح نتائج مرتب کر سکے۔ ایسے شخص کو بے چون و چرا کہنا پڑے گا کہ جس طرح زوال وانحطاط کی زندگی کو صحیح ''زندگی'' سے کوئی نسبت نہیں، کوئی علاقہ نہیں، چہ جائیکہ وہ ان کا موازنہ کریں اور ان کی قدر و قیمت کا پتہ لگائیں۔ اور اگر کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ''زندہ خیالات'' ایک نئی اور الگ دنیا کے خیالات تصور کیے جائیں اور ان کی انتہائی داد جودی جا سکے وہ حیرت واستعجاب ہو اور بس۔

اقبال بھی مشرق میں پیدا ہوا! یہ سچ ہے، مگر کون ہے جو ارتقاء کے کرشموں سے واقف ہوں، علل و اسباب کی عجائب آفرینی کا مبصر ہو اور پھر اس بات سے انکار کرے کہ قدرت کو جب کسی قوم کو نئی روح بخشنی ہوتی ہو، اسے نئے قالب میں ڈھالنا مقصود ہوتا ہے تو اس قوم ہی سے پہلے نئی روح، نئی عقل اور نئے احساس کے افراد پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ افراد جن کی ہستیاں ایک عظیم الشان انقلاب زندگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، وہ افراد جن کے اقوال اگرچہ ابتدا میں عالم بالا کی باتیں متصور ہوتی ہیں، مگر جونہی لوگ ان کی صداؤں سے مانوس ہوتے ہیں، ان کی دعوت پر کان دھرتے ہیں، ان کے خیالات وارشادات کو جذب کرتے ہیں اور ان کے کہنے پر عمل کے لیے کمر بستہ جو جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ خود ویسا ہی سوچنا اور ویسا ہی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر نہ وہ ہستیاں رہتی ہیں، اور نہ ان کے خیالات معمولی خیالات متصور ہوتے ہیں۔ غرض فطرت کو جن

اقوام میں انقلاب منظور ہوتا ہے غیر معمولی افراد بھی انھی سے پیدا ہوتے ہیں۔

اقبال کس مضبوط فلسفہ کی بنیاد ڈال رہا ہے! ابنائے جنس کو کن مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کیا ہستی ہے؟ فرد کیا ہے؟ وہ کامل کس طرح ہوسکتا ہے؟ قوم کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ تمام دنیا ایک ہی قوم کیسے بن سکتی ہے؟ پھر اقبال کے پاک جذبات کس عالمگیر اخوت کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ اس کی باریک نگاہ تمام عالم کو کس ایک معاشرت اور ایک تمدن میں دیکھنے کی آرزومند ہے۔ اس کا محبت بھرا دل کس مساوات کا متمنی ہے۔ وہ کس وحشت کے ساتھ دوئی سے گریزاں ہے۔ کس درد سے یک رنگی کا وارفتہ ہے؟ یہ سب ایسے حقائق ہیں کہ افراد کو افراد بنانے کے لیے، قوموں کو ایک قوم میں ظاہر ہونے کے لیے اور دنیا کو ایک دنیا کہلانے کے لیے بغیر ان کی طرف رجوع کیے چارہ نہیں۔

سال گزر رہے ہیں، علامہ موصوف نے خدا جانے کتنے عرصہ کے فکر و تدبر اور دماغ سوزی کے بعد اپنی صحیح و اعلیٰ قوت فکر یہ کی بدولت بنی نوع کے لیے مکمل حیات فردیہ کے حصول کا نسخہ تجویز کیا۔ مثنوی اسرار خودی کی شکل میں نسخہ چھپا اور لوگوں نے دیکھا، بنی نوع پر تو یہ ایک عام احسان تھا۔ مخصوص مورد اس انعام کے ہم مشرقی لوگ تھے اور پھر ان میں مختص ہم ہندوستانی جن کی زندگی اصل انسانی زندگی سے کہیں دور ہے، جن کے نفس مردہ ہو چکے ہیں، جن کی قویٰ ضعف کا شکار ہیں، جن کی ہمتیں سو چکی ہیں، جن کے دماغ پست خیالات کا گھر ہیں اور جن کی زندگی ایک طویل شیریں حالت نزع ہے۔ مگر افسوس نہ صرف ہم مریضوں کو بلحاظ افراد ابھی تک پوری واقفیت نہیں ہوئی کہ یہ نسخہ ہمارے ہی مرض کا علاج ہے بلکہ ہمارے مدعی نباضوں کی تشخیص اب تک یہ دریافت کرنے سے قاصر ہے کہ یہی وہ دوا ہے جو کافی وشافی ہوسکتی ہے اور ہم جو علاج آج تک عمل میں لا رہے ہیں وہ مریض کو اور مریض بنانے میں ممد ہیں نہ کہ اسے صحت و تندرستی عطا کرنے میں، اور نہ صرف یہ کہ قومی پیشواؤں اور مبلغوں نے اس کتاب میں نگاہ نہیں کی اور افراد ملت کو مکمل افراد بنانے کے درپے نہیں ہوئے بلکہ ادباء وشعرا جن کی نظر عام نظروں سے گہری ہونی چاہیے اور جن کا مذاق سخن عام مذاقوں سے زیادہ لطیف اور زیادہ پاکیزہ ہونا ضروری ہے، وہ بھی بلحاظ شعر و ادب کے ابھی تک اس کی خوبیوں سے نا آشنا ہیں۔ مگر نا آشنا ہوں بھی کیوں نہ، ہم خود کہہ چکے ہیں کہ زوال و انحطاط کے زمانہ کے خیالات اور مذاق اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کی حقائق و دقائق تک رسائی ہو۔ جب ہم حقیقی زندگی ہی سے روشناس نہیں تو حقیقی ادب اور حقیقی شعر کو کیا سمجھیں گے اور ہمارے اس کتاب کے طرف ابھی تک بہت تھوڑا تامل ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ہم علم و ادب کی انتہائی وسعتوں سے آشنا نہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ شعر سے دنیا میں کیا کیا کام لیے جا سکتے ہیں، زندہ اقوام کے اشعار میں مضامین کیسے ہو سکتے ہیں اور کیوں ہوتے ہیں؟ ان کے اسلوب بیان میں کیا سحر ہوتا ہے۔ پھر شعریت کیا ہے اور شعریت

کے کون سے اثرات زندگی بخش ہیں اور کون سے مرگ آور؟

ہمارے نقاد مثنوی اسرار خودی کی کسی ایک خوبی کو آج تک پورے طور پر واضح نہ کر سکے۔ اس کے مطالب و معانی کو کماحقہ ادراک نہ کر سکے، یہ نہ جان سکے کہ سلسلۂ خیالات کس مرکز سے کس ربط وضبط کے ساتھ زمین سے اٹھا ہے اور کس قوت و اعجاز سے آسمان تک پہنچ کر تمام فضا میں بسیط ہو رہا ہے۔ بلکہ علم و ادب کی حقیقت سے اپنے بے بہرہ ہونے کا ثبوت اس طرح دیا ہے کہ اسرار خودی میں حافظ خواجہ علیہ الرحمہ کے ادب پر جو تنقید تھی اسے اپنی کم فہمی سے خواجہ کی بزرگی پر حملہ سمجھا۔ گویا نہ صرف ادب کو سمجھنے سے قاصر رہے بلکہ نقاد کہلا کر تنقید کے سمجھنے سے درماندگی کا ثبوت دیا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے، کس قدر علم و ادب کی حقیقت سے ناآشنائی کا اظہار ہے کہ اسرار خودی کے ادب کو جو آج مغرب کے ادباء کو محو حیرت کر رہا ہے نہ سمجھنا تو درکنار ہماری نقاد میں ایک معمولی ادبی تنقید کو نہ سمجھ سکے، اور پھر اس پر جو ہمہ دانی کے دعوے ہیں، وہ خدا ہی جانتا ہے۔

ہم پھر بھول رہے ہیں، ہمارا افسوس ناحق ہے اور ہمارے گلیوں کی بنا پر ناحق ہے۔ ہم اس وقت تک اسرار خودی کو نہ سمجھ سکتے تھے جب تک کہ زندہ قومیں اسے پہلے نہ سمجھ لیتیں۔ اور ہمارے سمجھانے کے لیے اس کی تشریح میں کچھ نہ کچھ لکھ چکتیں۔ مثنوی مذکور کے انگلستان میں انگریزی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد کئی مغربی ادیب اور فلسفی اور نقاد اس پر رائے زنی کر چکے ہیں۔ انھی تنقیدوں میں سے ایک تنقید کا ترجمہ ہم ناظرین اور بالخصوص نقاد حضرات کے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ جان لیں ہم اسرار خودی کو کیا سمجھتے تھے اور ''خودی'' کے مالکوں نے اسرار خودی کو کیا سمجھا ہے۔ اس مضمون سے یہ بھی واضح ہوگا کہ علم وادب کی کیا حقیقت و وسعت ہے اور اگر دنیا ''آج'' کی دنیا بنی ہے تو ادب ہی کے اثرات سے بنی ہے اور اگر ''کل'' کی دنیا بنے گی تو اسی کے کرشموں سے۔ اس تنقید میں یہ حقیقت پڑھ کر ہمارے نقاد ان ادب کی اور بھی آنکھیں کھلیں گی کہ زندہ اقوام کے ادباء کے نزدیک اگر کوئی مفید اور زندہ ادب لکھنے والا، مفید اور زندہ شعر کہنے والا، مفید اور زندہ فلسفہ کا سبق دینے والا اس وقت تمام دنیا میں زندہ ادیب، زندہ شاعر، زندہ فلسفی ہے تو وہ صرف ایک اقبال ہے اور بس، اور حیات انسانی کا اصل راز اگر کسی نے آج تک سمجھا ہے تو اسی نے۔

فاضل نقاد نے جس خوبی اور قابلیت سے اسرار خودی کے اصل جوہر کو ہمیں دکھایا ہے، ہم فی الحقیقت اس کی داد نہیں دے سکتے۔ دنیا کے دو مشہور ترین فلسفی ادباء (نٹشا اور وٹمین) سے جن کا سکہ موجودہ وقت میں تمام اہل مغرب پر ہے اقبال کا مقابلہ کر کے دکھا دیا ہے کہ وہ دونوں حضرات مدت العمر میں انسان کے متعلق جس نکتہ کو نہ سمجھ سکے، اسے اقبال کی حقائق شناسی نے کس خوبی اور سادگی سے دنیا کا صحیح مطمح نظر بنا کر دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

اس تنقید کا لکھنے والا امریکہ کا مشہور فاضل فلسفی، ادیب اور نقاد مسٹر ہربرٹ ریڈ ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے اور سمجھنے کا لطف تو اصل زبان انگریزی ہی میں ہے۔ ترجمہ اس مفہوم کو کیا ادا کرے گا، جو اصل مضمون نگار کے انگریزی الفاظ میں مضمر ہے۔ یہ مضمون امریکہ کے اخبار نیو ایج (*New Age*) مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء میں چھپا تھا۔

وٹمین امریکہ کا سب سے بڑا فلسفی شاعر ہے، اس کے کلام پر امریکہ کے ایک نقاد مسٹر لارنس نے اپنی تنقید شائع کی تھی۔ مسٹر ہربرٹ ریڈ یہ شکایت کرتا ہوا کہ صحیح تنقید اب ادبی دنیا میں مفقود ہے، اس تنقید پر نظر ثانی کرتا ہے۔ اس کی داد دینے کے بعد خود بتاتا ہے کہ وٹمین کے کلام میں کیا کیا خصوصی کمالات تھے۔ پھر اس کے کمالات کے بعض نقائص پر جو مسٹر لارنس نے لکھے ہیں، بحث کا آغاز کرتے اس طرح قلم کو جولانی دیتا ہے:

> مسٹر لارنس نے جس خوبی کے ساتھ ''وٹمین'' کی متذکرہ بالا حقیقت آفرینی کو بے نقاب کیا ہے بعینہ ویسی تدقیق وتنقید سے اس ''شاعرانہ کذب'' کے عنصر کو بھی جو اس کے کلام میں پایا جاتا ہے، بالتشریح واضح کر دیا ہے، کیونکہ ''وٹمین'' باوجود اپنی تمام عظمت وعلو مرتبت کے ''کامل شاعر'' نہ تھا۔ مگر اس کے کلام کی تصور کے اس رخ پر چنداں اصرار کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک اس ''شاعرانہ کذب''، تخیل کی محدود جولانی اور تعینات عالم سے چشم پوشی کے مسئلہ سے تعلق ہے اس کے کلام سے عیاں ہے اور بالکل اظہر من الشمس۔ اس کی شاعری کے اور بھی پہلو ہیں۔ ضبط تخیل، اثبات تعینات اور یہ وہ پہلو ہیں جن کے سامنے لطیف اندرونی احساس کی بوقلمونی ہیچ نظر آتی ہے اور یہی پہلو ہیں جو زیادہ مستحق توجہ ہیں۔ ان معنوں میں ''وٹمین'' کے قلم سے حسن نگارش پا چکی ہے۔ یہ ''وٹمین'' کی کتاب ڈیمو کریٹک و سٹاز (مناظر جمہوریہ) کے صفحات میں پوشیدہ ایک ''فٹ نوٹ'' ہے جو اس قدر جلی نہیں کہ قاری کی توجہ کو خود بخود اپنی طرف توجہ مبذول کر لے۔ اس لیے مجھے حق ہے کہ میں اسے اس مقام پر نقل کر دوں۔

ادبی صناعت و بداعت کی معنی آفرینی کا منتہائے عروج، اس کا حاصل، اس کی حظ وانبساط کی انتہائی وسعتیں جو روح انسانی کی بلند پروازی کے لیے ممکن ہوسکتی ہیں، سب ''مابعد الطبیعات'' کے حقائق ولطائف ہیں۔ علم روحانی کے غوامض واسرار، خود روح اور ہمارے تشخیص ذاتی کی بقا ودوام کا مسئلہ بھی اسی میں شامل ہے۔ تمام قرآن میں نفس انسانی کی رسائی اس منزل تک ہوتی رہی ہے اور آئندہ ہوتی رہے گی۔ کم سے کم اس نکتہ میں تو بلا امتیاز نسل و زمانہ تمام بنی نوع ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں بلکہ اس کی تحسین وتوصیف میں بھی متقدمین ومتاخرین تمام کے تمام ہم آہنگ ہیں۔ انسانی نگاہ میں وہی مصنفین محبوب ترین ہیں جو اس میدان کے شہسوار ہیں اور اگر چہ ان کا صلہ چاندی سونے کے سکوں کے سوا اور کچھ نہیں اور اگر چہ بالآخر کچھ

ہوتو صرف یہ کہ شہرت ان کے قدم چومے اور عظمت وفضیلت کا تاج ان کے سر پر رکھا جائے۔مگر بایں ہمہ ابتذال ان کے رشحات قلم (جن میں اگر چہ از روئے حسن بیان سقم بھی ہوں) وہ انمول موتی ہیں جن کو دنیا جان سے بڑھ کر عزیز ومحفوظ رکھے گی۔

ادب وشاعری کا منتہی ہمیشہ مذہب رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔وید، ژند، اوستا، تالمود، زبور، مسیح اور اس کے تلامذہ اناجیل، تصانیف افلاطون، قرآن علیٰ ہذا القیاس ہمارے زمانہ میں سویڈنبرگ کی تحریریں۔پھر لیبنٹز، کانٹ اور ہیگل کے گراں بہا افکار، سب ایسے اعلیٰ پایہ کے ادبی ذخائر ہیں جو علم وادب کی حقیقی بلندیوں اور عروج کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں جس طرح دنیا کے عظیم الشان پہاڑ سطح دنیا سے بلند ونمایاں سر بفلک نظر آتے ہیں۔پھر ان کے دوش بدوش شعراء کے وہ نتائج طبع بھی ہمیشہ حرز جاں بنے رہیں گے جن میں اشخاص و واقعات، جذبات بہیمیہ انسانی اور مناظر عالم مادی کے متعلق راگنیاں الاپنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے کلام میں مذہبی انداز اور شعور اسرار کے علاوہ مستقبل، غیب، شہود، مشیت، غایت تکوین عالم وغیرہ وغیرہ مسائل پر حصول اطلاع کے مضامین کو بھی کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بلکہ بالواسطہ ہر ادائے بیان میں ان نکات کو ادا کر جاتے ہیں۔

مگر یہ علم ادب کے نقد و ماہیت کی بجائے اس کی وسعت استعدادی کی تعریف ہے، جو ''وٹمین'' نے کی ہے۔یعنی یہ ادب کا ''کم'' ہے نہ کہ اس کا ''کیف''۔یہ تعریف ''انداز بیان'' و''حسن ادا'' کے مسئلہ کو حل نہیں کرتی بلکہ اپنے الفاظ کی سادگی میں اسے پائمال کر جاتی ہے (یہ گرامی تصانیف جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، علم حسن الاعیان کے نظریہ سے خواہ کتنی سقیم ہوں اپنی ذاتی خوبی میں ہمیشہ پاک و بے عیب ہیں۔ان کی طاقت فکر کی آتش سیری دشت خیالات میں نیا جادو پیدا کرتی ہے اور قلوب انسانی کو پگھلا کر تمام عالم کو نئی شکل میں متشکل کر جاتی ہے) مگر ان توضیحات کے زیر شرائط ''وٹمین'' کا مذکورہ صدر ''منتہی'' ہے وہ صحیح ونقد ''منتہی'' ہے جو ''عمل'' و''بلاواسطہ افادہ'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر طرح موزوں ومناسب ہے۔آج اس مقام اور اس زمانہ میں اس ''منتہی'' کو نگاہ رکھتے ہوئے میرے ذہن میں اگر کسی زندہ شاعر کا خیال آ سکتا ہے جو اس میزان میں پورا اتر سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے اور وہ بھی لازمی طور پر نہ ہمارا ہم قوم اور نہ ہمارا ہم مذہب۔میری مراد اقبال سے ہے، جس کی نظم ''اسرارخودی'' ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ڈاکٹر رینلڈ نکلسن کے قلم سے اصل زبان فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر میسرز میکمیلن کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔اس زمانے میں جب کہ ہمارے ہم وطن متشاعر بلیوں اور بٹیروں پر تک بندیوں سے اپنے یاروں کی ضیافت طبع کا سامان پیدا کر رہے تھے اور کیٹس کے انداز پر پیش پا افتادہ مضامین پر طبع آزمائیوں میں مشغول تھے عین اس وقت لاہور میں یہ نظم جس کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے

خیالات میں ایک محشر برپا کر دیا ہے، تصنیف کی گئی اور شائع کی گئی۔ ایک ہندی مسلمان نے لکھا ہے کہ ''اقبال ہم میں مسیح بن کر نمودار ہوا ہے جس نے مردہ اجسام کو جنبش دے کر ان میں حیات تازہ کی لہر دوڑا دی ہے''۔ تم پوچھو گے یہ کیا ٹوٹکا تھا جس نے نادان خریداروں کے دلوں کو موہ لیا؟ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کوئی ٹوٹکا نہ تھا، کسی سیاسی مجذوب کی بڑ نہ تھی، کسی مکتی فوج کے نجات فروش کا نسخہ نجات نہ تھا بلکہ یہ اس نظم کا اثر تھا جس کا حسن معنوی موجودہ فلسفہ کے اہم ترین نکات و دقائق پر حاوی ہے۔ یہ اس نکتہ آفرینی کا طلسم تھا جس نے افکار کی گونا گونی سے وحدت ایمانی پیدا کر دی ہے۔ یہ اس حقیقت ترجمانی کا سحر حلال تھا جس نے ایک ایسی منطق کو جو محض مدرسوں کے طلبا تک ہی محدود و مخصوص تھی، ایک عالمگیر الہام کی صورت میں بدل کر عالم کے سامنے رکھ دیا ہے۔

اقبال اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اس کے افکار نٹشے کے خیالات سے متاثر ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ نٹشے سے اس کا موازنہ ناگزیر ہے۔ نٹشے کا ''فوق الانسان'' اقبال کے ''انسان کامل'' سے صرف اتفاقی اوصاف میں مختلف ہے اگرچہ اول الذکر کی بنیاد امرا کے باطل تمدن پر ہے اور موخر الذکر، جہاں تک میرا خیال ہے ان معنوں میں زیادہ یقینی اور مستحکم بنا پر مبنی ہے، کہ اس کی تعریف میں ''منتہی'' (یعنی کسی سقراط، کسی مسیحؑ، کسی محمدؐ) کا صحبت آشنا ہونا یا اس کے ازروئے پیدائش مکمل ہونا تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ اسے فطرت کے قوائے مولدہ کا مآل و مقصود ٹھہرایا گیا ہے، ساتھ ہی اس کے اقبال کا ''انسان کامل'' ارتقاء جمہور کا منتہی ہے۔ وہ ایک اصول ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہر انسان ایک منتشر طاقت کا مرکز ہے۔ جس کے ممکنات زندگی ایک خاص طریق عمل سے ترقی پا سکتے ہیں۔ انسانیت کا یہ نصب العین حقیقت کے زیادہ قریب ہے اور اس لحاظ سے ڈمین کے ''نفس متوسطہ'' سے زیادہ مناسب و متشابہ ہے۔ تاہم تینوں نصب العینوں کی تہ میں ایک ابتدائی خواہش یا خیال مضمر ہے۔ ان میں فرق صرف اس قدر ہے جس قدر ان کے دیکھنے میں پیش بینی سے کام لیا جاتا ہے۔ ازروئے مذہب ان سب کی بنیاد یہ اعتقاد ہے کہ انسان ایک قوت الٰہیہ کی کشش و جذب سے پیدا ہوتا ہے اور ارتقاء پاتا ہے جس کا نام ''خدا'' ہے۔ ازروئے سائنس مفروضہ یہ ہے کہ ہیئت واقعات میں ایک قوت مولدہ داخل کی جاتی ہے، جو شعور انسانی پر از خود جلوہ گر ہوتی ہے اور نفس انسانی کے شعور و ادراک کو ہمیشہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ ازروئے مابعد الطبیعیات یہ دونوں پہلو جن میں سے ایک مذہب نے اختیار کیا ہے اور دوسرا سائنس نے متحد ہیں۔ ''زندگی (میں اقبال کی نظم کی تمہید سے نقل کرتا ہوں) ایک متقدم حرکت جذب و ہضم ہے۔ یہ اپنی پیش روی میں اپنے رستہ کی تمام رکاوٹوں کو خود اپنے اندر جذب کر کے دور کرتی جاتی ہے۔ آرزوؤں اور نصب العینوں کا مسلسل پیدا کرتے رہنا اس کا اصلی جوہر ہے اور اس نے اپنی حفاظت و توسیع کے لیے ایسے ایسے آلے (حواس، عقل وغیرہ وغیرہ) ایجاد کیے ہیں یا خود اپنی

ہی ذات میں پیدا کر لیے ہیں جو اس کے سنگ ہائے راہ کو جذب کرنے اور اس کے اپنے مشابہ بنانے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ زندگی کے رستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے یا یوں کہو کہ نیچر ہے۔ تاہم نیچر اس لحاظ سے کہ وہ زندگی کی اندرونی طاقتوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ عدم سے وجود میں آئیں، اپنی ذات میں شر نہیں''۔ لہٰذا زندگی ایک سعی آزادی ہے۔ اور اس سعی کا طریق ''انا'' کی تعلیم ہے یا دوسرے الفاظ میں جیسے خود محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بتایا: تخلقوا باخلاق اللّٰہ (اپنے اندر اخلاق پیدا کرو)۔ یہ حدیث ہمیں وٹمین کا یہ قول یاد دلاتی ہے۔ ''میں مکمل اشیاء کی انتہا ہوں اور پیدا ہونے والی اشیاء کا محیط''۔

وٹمین نے یہ بھی کہا ہے کہ ''میں خدا کو مردوں اور عورتوں کے چہروں میں دیکھتا ہوں اور خود اپنے چہرے میں جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں''۔ نٹشے نے اسی نصب العین کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''خالق اپنے ایسے اور خالقوں کی جستجو میں رہتا ہے''۔ اور فی الحقیقت سارے کا سارا مذہب اور سارے کا سارا فلسفہ بالآخر اسی تکمیل خودی کے اصول میں آ جمع ہوتا ہے۔ از روئے نفسیات بھی انسان کسی ایسی الوہیت کو تسلیم نہیں کر سکتا، جس کا وہ خود مظہر نہیں اور معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ امر ایک صداقت طبعیہ ہے۔ اقبال نے صداقت کا، نٹشے یا وٹمین کی نسبت زیادہ وثوق سے ادراک کیا ہے۔ وٹمین کا ''نفس متوسط'' مبہم و غیر متشخص ہے اور نہ اس قدر جامع ہی ہے جیسا کہ ایک منتہی کو ہونا ضروری ہے۔ نٹشے کا ''فوق الانسان'' صحبت انسان سے گریزاں اور نفور ہے۔ اس لیے جبلتاً باطل ہے۔ مگر اقبال کا ''انسان کامل''، ''نفس متوسطہ'' ہے اور جلیس ہمدرد اور اقبال کا ''نفس متوسطہ''، ''انسان کامل'' گویا:

''خود صنم ہے خود پرستار صنم''

با خودی شنید ز افکار خودی
نعرہ زد از گنج ''اسرار خودی''

وا نہ گشتہ برمن بے خود ہنوز
سرے از ''اسرار'' و رمزے از ''رموز''

❁...❁...❁